© rasailojaraid.com

جماعت سازی اور اس کی بنیادیں (۳)

قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار☆

③ بیعت کے بارے میں معاصر علماء کے اقوال

(۱) ابوعبدالرحمٰن عقیل بن محمد بن زید المقطری المصری اقسامِ بیعت کے تحت لکھتے ہیں:

''بیعت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عام بیعت: بیعت کی یہ قسم عام بیعت میں سے ہے، اسے توڑنے یا ترک کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ بیعت (عہد) اگر کسی جائز (مشروع) کام کے لیے ہو تو جائز ہے، بلکہ بعض اوقات واجب ہے۔ اور اگر یہ بیعت کسی ناجائز (منکر) کام کے لیے ہو تو ناجائز ہے اور اس کے ناجائز ہونے پر یہ آیت مبارکہ دلیل ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪﴾ (المائدة:۲)

''نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

سورۃ المائدۃ کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ﴾ (المائدة:۱)

''اے ایمان والو! عہدوں کی پاسداری کرو۔''

(۲) بیعت خاص: یہ وہ بیعت ہے جو امام المسلمین (خلیفہ اسلام) کے لیے ہے اور یہ بیعت واجب ہے، اس کو ترک کرنا گناہ ہے، جبکہ بیعت کرنے والا بیعت کرنے پر قادر ہو''۔ (٦٤)

(۲) ڈاکٹر یوسف القرضاوی ''العمل الاسلامی الجماعی۔ رأی واجتھاد'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اسلام کے لیے اجتماعی شکل میں کام کرنا ایک ضرورت بھی ہے اور فریضہ بھی، بشری ضرورت بھی ہے اور شرعی ضرورت بھی۔ پس اجتماعی عمل ایک بشری ضرورت ہے، کیونکہ انسان بذاتِ خود قلیل

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی لاہور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(یکہ وتنہا) ہے' اور اپنے بھائیوں (باقی انسانوں) کی وجہ سے کثیر (زیادہ) ہے۔ اور شرعی فرض اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں اجتماعیت اور اتحاد کے بارے میں تاکید کی ہے۔ ایک جماعت کا تصور بغیر تنظیم وتنسیق' قیادت اور کارکنان کے اور پلان اور ہدف کے' بغیر مقصد کے تحقق کے' ممکن نہیں ہے''۔

شیخ قرضاوی مزید لکھتے ہیں:

''دین ہمیں نیکی اور تقویٰ میں اتحاد اور تعاون کا حکم دیتا ہے۔ یہ نیکی اور تقویٰ اہم اور خاص اعمال میں سے ہیں۔ نتیجہ خیز اسلامی کام کے لیے تنظیم ضروری ہے' صرف اجتماع کافی نہیں ہے' جب تک وہ منظم نہ ہو۔ درحقیقت اجتماع ہی نہیں جب تک تنظیم نہ ہو' اور تنظیم کے لیے ذمہ دار قیادت اور فرماں بردار کارکن (سپاہی) موجود ہوں۔ اسلام ہر کام کے بارے میں تنظیم پر زور دیتا ہے' حتیٰ کہ بعض اوقات عادی امور میں بھی' جیسا کہ سفر کے سلسلہ میں بھی امیر بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور ایک شرعی قیادت اُس وقت تک فائدہ مند نہیں جب تک وہ ایک آزاد رائے اور صحیح بیعت کی صورت میں سامنے نہ آئے اور بعض خلافِ واقعہ حالتوں میں اجتماعی قیادت کے وجود میں کوئی ممانعت نہیں ہے' بلکہ ضروری ہوگا کہ تمام اسلامی ملکوں میں اسلامی جماعت قائم ہو جائے' جو دعوت کی ذمہ داری اٹھائے۔ اور اسلامی معاشرے کو بیدار کرنے کے لیے' اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اور قرآن کی حاکمیت اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے راستہ ہموار کر سکے۔'' (٦٥)

(۳) استاذ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اس سوال کے جواب میں کہ آیا بیعت سربراہِ جماعت کے لیے دینا بھی جائز ہے یا یہ کہ بیعت صرف خلیفہ (یعنی اسلامی ریاست کے سربراہ) تک محدود ہے؟ رقمطراز ہیں:

''بیعت ایک عقد ہے جو سربراہِ جماعت (یعنی امیر جماعت) کے لیے اسی طرح جائز ہے جس طرح خلیفہ کے لیے جائز ہے۔ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ خلیفہ کی بیعت کا موضوع ہے ریاست اور حکومت سے متعلق عام امور پر اتفاق کرنا' جبکہ سربراہِ جماعت (امیر جماعت) کے ساتھ بیعت نظامِ جماعت کی حفاظت اور جماعت کے اہداف کو یقینی بنانے پر ہے۔ اور یہ بیعت سربراہِ ریاست کی بیعت کے قائم مقام نہیں ہے......'' (٦٦)

(۴) ڈاکٹر فتحی یکن اور استاذ فتحی عبدالستار کے فتویٰ سے ایک اقتباس:

''حقیقت میں بیعت جو کسی جماعت/انجمن/یا جماعات میں سے کسی کو دی جاتی ہے وہ بیعت درحقیقت از قبیل عقد ہوتی ہے اور اس بیعت سے مراد ومقصود نیک عمل پر التزام ہوتا ہے' جس پر جانبین کی طرف سے اتفاق ہو گیا ہو......ایسی صورت میں ہمیں حکم ہے کہ عقود ومعاہدات اور مواثیق کو پورا کریں' مگر اس بیعت کو توڑنے کی صورت میں اس پر کچھ بھی مؤاخذہ نہیں ہوتا' جیسا کہ خروج عن الملة (ملت سے نکلنا)۔ البتہ لزومِ جماعت کے حوالے سے موجود احادیث کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اطلاق جماعات پر نہیں ہے' بلکہ ان سب احادیث سے یہاں پر مراد ایک جامع معنی میں جماعت مراد ہے (یعنی ساری کی ساری اُمت) اور جماعتی بیعت توڑنے کی صورت میں فقہاء اس بیعت کا قیاس قسم پر کرتے ہیں اور قسم توڑنے کا کفارہ بیعت توڑنے کا کفارہ تصور ہوگا۔ یہ بیعت توڑنا خواہ کسی بھی وجہ سے ہو جائز نہیں' کیونکہ حقیقت میں یہ طبعی طور پر عہد سے وفا ہے اور عہد کو توڑنا نفاق (منافقت) کا ایک شعبہ ہے''۔(٦٧)

(۵) الشیخ سلیمان العودہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اسلامی جماعت جس کے ارکان (رفقاء) جماعت کے امیر کے ساتھ سمع و طاعت کی بیعت کرتے ہیں' اُن کے لیے ایسے حال میں کیا حکم ہے جب کچھ اوامر خلافِ شرع نہ ہوں اور شریعت سے متعارض نہ ہوں' تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا شخصی التزام منت (نذر) کے مشابہ ہے' جس میں مکلّف خود اپنے اوپر لازم قرار دے دیتا ہے جو شریعت نے اصلاً اس پر واجب نہیں کیا اور میں ذاتی طور پر اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ مگر ضرورت اور ظاہری مصلحت کی صورت میں مکروہ نہیں ہے''۔(٦٨)

(٦) مولانا ثناء اللہ امرتسری ؒ کی رائے ہے کہ امامت کبریٰ اور اطاعت و فرماں برداری والی حدیثوں کو تنظیمی امور کی امارتوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے' چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''امارت سیاسیہ اس ملک میں ناپید ہے اور شاید عرصہ تک ناپید ہی رہے' اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ اس کے لیے مزید بحث نہیں۔ دوسری امارتیں' وہ ممکن ہے' مثلاً امیر عائلہ یعنی خاندانی امیر یا امیر سفر یا امیر خاص قوم یا خاص گروہ' ان امارتوں کا وہ حکم نہیں ہے جو امیر سیاست کا ہے۔ آج کل جو کہیں کہیں سے امیر بننے کی خبریں آتی ہیں یا بن جاتے ہیں ان کی حدود صرف اتنی ہیں کہ جو اُن کے حلقہ بیعت میں آ جائے اس کو حکم یا مشورہ دیں' اس سے تجاوز نہ کریں۔ یعنی یہ حکم نہ لگائیں کہ جو ہم میں داخل نہیں ہے وہ موتِ جاہلیت مرے گا۔ اگر ایسا کریں تو میں اُن امارتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتا مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جائیں' یعنی یہ حکم لگائیں کہ جو اُن کے حلقہ میں داخل نہ ہوئے ہوں ان کی خیرات وصدقات قبول نہیں' ان کا جمعہ جماعت صحیح نہیں ہے' ایسی حالت میں ان امیروں سے کہا جائے گا: ﴿لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ﴾ (المائدۃ:۷۷) میں اس امر کو جائز سمجھتا ہوں کہ ایسی امارتیں ہر شہر اور ہر بستی میں قائم ہو جائیں جس میں باہمی نفاق و شقاق نہ ہو' بے شک وہ اپنے حلقۂ اثر سے صدقات اور زکوٰۃ جمع کر کے غرباء پر تقسیم کریں نہ اپنے نفس پر' نہ اپنے لیے جمع کریں۔ بس یہ ہے ایک طریق امارت جو معمول ہو سکتا ہے اور بحکم ارشاد الٰہی: ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:٢٨٦) جائز اور مشروع ہے''۔(٦٩)

(۷) مذکورہ تحریر کی تائید میں ایک سلفی عالم شیخ ممتاز احمد عبداللطیف اس طرح رقم طراز ہیں:

''یہی حق ہے' کیونکہ خلیفۃ المسلمین اپنی رعیت کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمہ دار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے‘ جبکہ تنظیمی امور کے امیروں کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے‘ بلکہ یہ ایک عارضی حل ہے جس کو ملکی حالات وظروف کے پیش نظر مختلف شکلوں میں ڈھالا جاتا ہے اور اس کے حل کے بعد خود بخود اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ تنظیمی اعتبار سے جو اصول وضوابط اور لائحہ عمل کسی نظام کو چلانے کے لیے وضع کیے جائیں اور وہ کتاب وسنت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں تو ان کی پابندی ضروری ہے...... تنظیمی امارت تو ایک وقتی ضرورت ہوتی ہے‘ اسے وقت کے ڈھانچے میں ڈھال کر کام کرنا چاہیے‘ خواہ اس نظام کا نام امارت رکھا جائے یا صدارت یا جمعیت یا جماعت۔ واللہ اعلم بالصواب۔‘‘(۷۰)

(۸) ڈاکٹر مصطفیٰ الطحان لکھتے ہیں:

’’وہ بیعت جو ایک فرد اسلامی تنظیم میں ایک امیر کو دیتا ہے وہ عقد ہے جو اُن کے حق میں وکالت کرے گا۔ تنظیمی امور کی تصریف (استعمال) میں شرعی اور قانونی ضابطوں کے ضمن میں‘ جو تنظیم کے لائحہ عمل میں شامل ہو‘ اگر امیر نے اس عقد پر وفا کیا تو ان کو افراد (کارکن) پر معروف میں سمع و طاعت کا حق ہوگا۔ اور بیعت کی پاسداری واجب ہے جبکہ بے وفائی وغداری حرام ہے۔ اگرچہ اسے توڑنا جائز ہے‘ وہ اس طرح کہ بیعت کرنے والا امیر سے مطالبہ کرے کہ مجھے اپنی بیعت سے فارغ کر دیں تاکہ میں جماعت (قائد) کی شرائط اور لوازمات سے الگ ہو جاؤں‘‘۔(۷۱)

(۹) ڈاکٹر محمد عبداللطیف البنا لکھتے ہیں:

’’بیعت تعاہد کے معنیٰ میں ہے اور اسلام معروف کاموں میں سے کسی کام پر بیعت لینے سے منع نہیں کرتا جب تک یہ بیعتِ اسلام‘ جو حکمران لیتے ہیں‘ کا مفہوم نہ لے اور بیعت لینے والا اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین نہ سمجھے۔ یہ نیک کام میں ہو‘ شر میں نہ ہو‘ تعمیر میں ہو تخریب میں نہ ہو۔ اس پر مندرجہ ذیل امور دلالت کرتے ہیں:

(۱) امیر کا بنانا اور اس کے لیے بیعت لینا ایک فطری حکم ہے: بعض ایسی امارتیں ہیں جو خاص حالات میں خاص ضرورتوں کے لیے بنی ہیں‘ جیسے امیر حج‘ امیر سفر اور امیر قتال۔ مثلاً خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی امارت موتہ میں۔ ایسی امارات اور بیعات طبعی اور فطری صورت میں بن جاتی ہیں اور یہ فطری امر ہر معاشرے میں ایک حقیقت ہے۔ اصل میں ایسی امارتوں اور بیعات میں جو معاملے تشکیل پاتے ہیں وہ ایک طبعی صورت میں پاتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ امامت کبریٰ کے قائم مقام ہے‘ بلکہ یہ ایک فطری امر ہے جو معاشرے میں ایک حقیقت ہے۔

(۲) ضرورتوں کی کثرت: اسلامی شریعت میں کچھ کام ایک طاقت وراجتماعیت کے محتاج ہوتے ہیں‘ جیسے نیکی کی طرف بلانا‘ برائی سے منع کرنا‘ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا‘ بدعت اور منکرات کا ازالہ کرنا اور اسلامی حکومت کا قیام۔ کیونکہ یہ کام فرد واحد نہیں کرسکتا کہ وہ اٹھے اور کرے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب ان کی طاقت اور اثر ورسوخ معاشرہ میں زیادہ ہو‘ اس کام کو انجام دینے کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کم از کم ایسی اجتماعیت ضروری ہے جو اِس کام کے معنی کو سمجھتی ہو۔

(۳) قیادت کی ضرورت اور اس کے لیے بیعت: جب یہ عارضی اجتماع منعقد کیا جاتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک امیر ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ)) (۷۲)

''جب تین بندے سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لیں''۔

اور جب امارت ہو تو امیر کے لیے ایک معلوم معاملے میں' جس پر جانبین کا اتفاق ہو' عہد اور بیعت لینا جائز ہے بشرطیکہ بیعت اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو (یعنی گناہ میں نہ ہو)۔

(۴) امام کے ساتھ منازعت نہ ہو: اس بیعت میں اس امیر کے لیے کوئی جھگڑا نہیں امامت کبریٰ کے لیے' کیونکہ اصل میں امام موجود نہیں ہے اور اگر موجود ہے تب بھی کوئی منازعہ (جھگڑا) نہیں ہے' بلکہ یہ ایک بیعت ہے۔ اسلام میں نیک اعمال میں سے کسی عمل کو' مردہ سنتوں میں سے کسی سنت کو زندہ کرنا ایک تعاہد کی شکل میں اور منظم صورت میں ہی انجام پاتا ہے اور یہ شرعی دلائل سے متصادم نہیں ہے' بلکہ ایسے بہت سارے دلائل ہمیں تعاون اور نیک عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ: ۲) ''اور ایک دوسرے سے تعاون کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں' اور ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو گناہ اور زیادتی کے کاموں میں۔''

(۵) یہ بیعت جنس نذر (منت) میں سے ہے: نیک اعمال میں سے کسی عمل پر کار بند رہنا دراصل اطاعت پر التزام ہے' یہ از قبیل نذر ہے اور نذر کی مشروعیت مطلقاً جائز ہے' اس میں کوئی اختلاف و نزاع نہیں ہے۔

خلاصہ: میرے (محمد عبداللطیف البنا کے) خیال میں جماعات کی بیعت میں جو رکاوٹ ہے وہ تعصب ہے' یعنی یہ سمجھنا کہ ''ہم ہی جماعت المسلمین ہیں' باقی نہیں'' یا کسی شر پر عہد لینا۔ بہرحال امیر جماعت کے لیے بیعت جائز ہے اور ان حدود سے تجاوز جائز نہیں ہے جس پر جانبین کی طرف سے اتفاق کیا گیا ہو''۔ (۷۳)

(۱۰) الشیخ عبدالعزیز عبدالقادر القاری ایک سوال کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

''اصل میں بیعت جماعت عظمیٰ (امامت کبریٰ) کے لیے ہے اور تعاقد اور تعاہد عرف غالب کی نظر میں جماعتِ صغریٰ کے لیے درست ہے' جیسا کہ عام لوگ کسی عالم کو اپنا امام اور قائد بنالیں اور درمیان میں طے ہو کہ بیعت کی جائے' تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ عہد مکی میں انصار نے جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقبہ کے مقام پر بیعت کی تو یہ پہلی بیعت پوشیدہ تھی جبکہ ابھی اسلامی حکومت نہیں بنی تھی اور انصار (اہل مدینہ) نے جب بیعت کی تو یہ بیعت بحیثیت ایک نبی کے تھی کہ وہ اللہ کے نبی ہیں' نہ کہ اسلامی دولت کے امیر کی۔ یا اگر ہم کبھی (کسی شخص کی بیعت کر لیں) ایک عام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بندے کی حیثیت سے جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں نہ کسی اور کی طرف''۔ (۷۴)

(۱۱) شیخ ولید بن علی الحسین عضو هيئة التدريس، قسیم یونیورسٹی سعودی عربیہ ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

''حقیقت میں جو بیعت آپ کسی تحریک یا جماعت سے کرتے ہیں وہ بیعت عقد کا طریقہ ہے، جس میں مراد اور مقصود عمل صالح پر التزام اور دوام ہے جس پر جانبین کی طرف سے اداراتی (تنظیمی) طور پر اتفاق ہو گیا ہو۔ یہ عقد ہے اور اللہ تعالیٰ نے عقدوں، عہدوں اور میثاقوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے ﴿اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ﴾ (المائدۃ:۱) اس طرح بیعت پر اور عقد توڑنے پر کسی طرح آثار مرتب نہیں، جو آثار بیعت کبریٰ کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں۔ جیسے خروج عن الملة (ملت سے نکلنا)''...... ''اگر بیعت توڑنے (چھوڑنے) کا ارادہ ہو جس کے ساتھ عقد ہے اس سے اجازت لے ورنہ کفارۃ النذر واجب ہوگا۔ اور معلوم ہونا چاہیے کہ اصل میں ایسے عقود میں وفاء ہے جب تک شرعی حکم کے ساتھ تصادم نہ ہو (واللہ اعلم)''(۷۵)

(۱۲) شیخ رائد صلاح حدیث سفر میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تشریح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ عہد امارتِ صغریٰ کے عقد میں درج ہے، اقامت دین کے لیے خیر اور معروف میں یہ ایک ضروری مرحلہ ہے۔ اسلام کے جھنڈے کو بلند تر کرنے کی خاطر اس عہد کو پورا کرنا ہر اس فرد کے لیے ضروری ہے جو اس جماعت کی قیادت سے بیعت کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡئُوۡلًا﴾ (الاسراء:۳۴) ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ﴾ (المائدۃ:۱) (۷۶)

(۱۳) استاد مصطفیٰ مشہور رحمہ اللہ نے بیعت کے بارے میں لکھا ہے:

''عظیم اسلامی اہداف کو حاصل کرنا ہر مسلمان و مسلمہ سے مطلوب ہے، لیکن ان اہداف کا حصول انفرادی طور پر ممکن نہیں ہے اور ان کوششوں کو بغیر جماعت کے انفرادی طور پر منظم کرنا ممکن نہیں۔ ان کے لیے لائحۂ عمل ترتیب دینا اور وسائل اور امکانیات فراہم کرنا بھی ممکن نہیں۔ ''ما لا يتم الواجب الا به فهو واجب'' (یعنی جس امر پر واجب کی ادائیگی موقوف ہو وہ بھی واجب ہے) کے مصداق ہم بغیر قیادت کے جماعت کا تصور نہیں کر سکتے اور قیادت کو قیادت نہیں کہہ سکتے، جب تک قیادت کو اپنے افراد پر سمع و طاعت کا حق نہ ہو۔ اور جماعت میں افراد کا ڈسپلن (تنظیم) بغیر اطاعت و فرماں برداری کے ممکن نہیں۔ بلکہ یہ تصور بھی محال ہے کہ جماعت کے افراد وفا کریں اور فرائض کی ادائیگی کا التزام کریں۔ یعنی بغیر امیر کے جماعت نہیں ہے اور وہ امیر نہیں ہے جس کو اپنے کارکن سمع و طاعت میں نہ مانیں۔ کارکن اُس وقت تک فرماں بردار نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے امیر کے ساتھ بیعت (عہد) نہ کریں۔''(۷۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۴) بانی تحریک اسلامی واخوان المسلمون استاد حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کوعھد العمل للاسلام سے تعبیر کیا ہے اور اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بیعت ہے اخلاص پر، خالص اللہ کے لیے، اور عمل پر اللہ کے دین کے لیے، وہ عمل جس کی شروعات معلوم اور آخر واضح ہو''۔ شیخ حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کے لیے دس ارکان (الفھم، الاخلاص، العمل، الجھاد، التضمیة، الطاعة، الثبات، التجرد، الاخوة، التقیة) اور تقریباً ۳۳ شرائط متعین کی ہیں۔ ان شرائط میں سے ایک شخصی عہدوں پر وفا کرنا بھی ہے اور اسی طرح دعوتی واجبات پر وفا کرنا وغیرہ۔(۷۸)

الاخوان المسلمون کے نزدیک بیعت کے الفاظ یہ ہیں:

اعاھد اللّٰہ العلی العظیم علی التمسک بدعوۃ الاخوان المسلمین والجھاد فی سبیلھا والقیام بشرائط عضویتھا والثقة التامة بقیادتھا والسمع والطاعة فی المنشط والمکرہ واقسم باللّٰہ العظیم علی ذلک وابایع علیه واللّٰہ علی ما اقول وکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ(۷۹)

(۱۵) الشیخ عبداللہ ناصح علوان، سابق استاد، اسلامک سٹڈیز، کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ بیعت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر اسلامی جماعت ہو، جو اِن ذمہ داریوں کو پوری کرنے والی اور اہداف کو حاصل کرنے والی ہو، تو ضروری ہے کہ اس کا امیر ہو اور امیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیعت لے۔ اور بیعت اُس امیر کی ہوگی جو اطاعت اور التزام کی بنیاد پر بیعت لے گا۔ اور اطاعت کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے لیے کام کیا جائے اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا جائے۔ اور جہاد اللہ کے دین اور زمین پر اللہ کے نظام اور حکم کو نافذ کرنے کے لیے تب ہوگا جب یہ ایک جماعت مضبوط بنیاد پر استوار ہو جو مؤمنوں کو ایک بڑے ہدف تک پہنچا سکتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، جیسا کہ مسلم شریف نے روایت کیا ہے: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ تَكُنْ فِي عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب تین بندے سفر میں ہوں تو واجب ہے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔ اور جب تین سے زیادہ یا اس سے بھی زیادہ ہوں اور ان کے پاس قدرت ہو، صلاحیت ہو، ایک مکمل نقشہ پیش کرنے میں، اور ماننے والا حلقہ ہو اور اہداف واضح ہوں مسلمانوں کی حالت بدلنے کے لیے جو ان کے لیے بہتر ہو، ایسی صورت میں قیادت کی ایجاد اور امیر کا تقرر ان پر من باب اولیٰ واجب ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ہر ایک پر واجب کیا ہے کہ جو امیر کے ساتھ بیعت کا عقد کرتے ہیں اور ان کی طاعت کا عہد کرتے ہیں، وہ مرتے دم تک اپنے عہد پر وفا کریں۔ عہد کو توڑنا مناسب نہیں ہے اور نہ خروج کرنا مناسب ہے جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک کہ کفر بواح کا حکم نہ دیں۔ حقیقت میں جو کچھ ہم نے پیش کیا' احادیث امارت اور بیعت اور طاعت وغیرہ کے حوالے سے' سب کچھ امامت کبریٰ پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ:

حقیقت میں امامت کبریٰ فی الحال مسلمانوں کے درمیان موجود نہیں ہے اور مخلص اسلامی جماعت اگر امامت کبریٰ کے وجود کے لیے کام کرتی ہے تو وہ زیادہ مستحق ہے کہ مسلمان اس جماعت کو لازم پکڑیں' اس کی بیعت کریں اور اس کے امیر کی طاعت کریں۔ اسلامی جماعت کا موجودہ وسائل اور اہداف سے مالا مال ہونا' بلادِ اسلامیہ میں ایک شرعی فرض اور ایک حتمی ضرورت ہے''۔(۸۰)

(**۱۶**) مولانا گوہر رحمٰن دیوبندی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

''ایمان و اسلام اللہ و رسول کی اطاعت و وفاداری کی بیعت ہی کا نام ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے صحابہ سے بیعت اطاعت اور بیعت جہاد لیا کرتے تھے جو تجدید بیعت ہوتی تھی ورنہ اصل بیعت اور عہد تو وہ ایمان لاتے وقت کر لیتے تھے۔ آج بھی اگر لوگ کسی متبع سنت عالم ربانی کے سامنے اپنے ربّ کی اطاعت کی وفاداری کی بیعت کی تجدید کر لیں تو مفید ہے اور اصلاحِ نفس کی ایک تدبیر ہے''۔(۸۱)

(**۱۷**) تاریخ نجد میں امام حسین بن غنام ذکر کرتے ہیں کہ: سن ۱۱۵۳ھ میں محمد بن عبدالوہاب نے اپنی دعوت کا اعلان کر کے مظاہر شرک و بدعت کا سختی سے انکار کیا اور امر بالمعروف والنھی عن المنکر ہر خاص و عام کی خیر خواہی اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے انتھک جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کرتے ہوئے علماء کرام کو خبردار کرتے ہوئے ان کی توجہ سورۃ البقرۃ کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ کی طرف مبذول کرائی:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ لا اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَیَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾﴾

''بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں جو اتاریں ہم نے روشن دلیلیں اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے لیے کتاب میں' یہی وہ لوگ ہیں کہ لعنت کرتا ہے ان پر اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے۔''

چنانچہ ان کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی' خاص طور پر حریملا' عیینہ' الدرعیہ' الریاض اور منفوحہ میں۔ ان کی دعوت کے نتیجہ میں عوام دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کی طرف سے تو ان کو بڑے پیمانے پر پذیرائی ملی' انہوں نے نہ صرف ان کے طریق کار کی پیروی کی بلکہ مختلف کتب' حدیث' فقہ' تفسیر کا درس حاصل کرتے ہوئے ان کی بیعت کی' ان کے ساتھ عہد کیا اور ان کی دعوت میں ان کے معاون بن گئے' جبکہ عوام کی غالب اکثریت ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئی۔(۸۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۸) دار الافتاء دار العلوم دیو بند' انڈیا سے اسلامی تحریکوں اور جماعات کے امراء کی بیعت کے بارے میں یہ سوال کیا گیا:

''کیا اسلامی تحریکوں اور جماعات کے امراء کو بیعت دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور وہ بھی ایسی صورت میں جب عمومی خیالات اور افکار عقائد اہل سنت والجماعت کے مطابق ہوں اور بغیر تعصب اور بغیر اس دعوت کے کہ صرف ہم ہی الجماعت ہیں باقی نہیں ہیں صرف اور صرف لاعلاء کلمۃ اللہ اور نظم جماعت کی خاطر آیا یہ عمل درست ہے یا نہیں؟ جواب مطلوب ہے''۔

دار الافتاء دار العلوم دیو بند کی جانب سے اس سوال کا یہ جواب دیا گیا:

''یہ تو محض ایک رسمی بیعت ہوتی ہے' جس میں بادشاہ کے ہاتھ میں لوگ بیعت لیتے ہیں اور بادشاہ ہر ایک سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ وہ تمام ذمہ داریوں کو بخوبی سنبھالے گا' اور عوام بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ بغاوت نہیں کریں گے۔ گویا کہ یہ ایک باہمی عہد و پیمان ہے' لیکن اس بیعت کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ شرعی امور میں بھی امیر ہوتے ہیں' مذکورہ بیان کردہ نوعیت کے ساتھ امراء کو بیعت دی جا سکتی ہے''۔ (۸۳)

حاصل کلام

(۱) لفظ بیعت کا اطلاق عقد' عہد' نذر' میثاق' قسم' شرط وغیرہ ہم معنی الفاظ پر کیا جاتا ہے۔ کچھ صورتوں میں یہ بیعت جائز ہے' جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے' اور بعض اوقات یہ واجب بن جاتی ہے۔ اور یہ مسنون بھی ہے' اس لیے کہ یہ تعامل صحابہؓ اور سلف صالحین سے ثابت ہے۔

(۲) بیعت اصلاً اسلامی حکومت و حکمران کے لیے ہے' لیکن جب اسلامی حکومت یا اسلامی شرائط پر اترنے والا حکمران موجود نہ ہو تو پھر عدم وجود کی صورت میں اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں کے لیے حالات اور ظروف کے مطابق مذکورہ بیعتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا مندوب' واجب اور فرض ہو جاتا ہے۔

(۳) بیعت سے متعلق اختلاف کی حدود صرف لفظی اختلاف کی حد تک ہیں' معنوی اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور جب معنوی اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں تو پھر اس صورت میں عمل کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قاعدۂ اصولیہ ہے کہ تمام عقود میں اصل اعتبار مقاصد اور معانی کا ہو گا' الفاظ اور کلام کی ترکیبوں اور عبارت کا نہ ہو گا' یعنی عقود کی تمام اقسام میں ان کے معانی مقصودہ کا اعتبار کرتے ہوئے ان کے مطابق عمل ہو گا' الفاظ کا تغیر و تبدل ان کو ان کے مقاصد شرعیہ سے علیحدہ نہ کر سکے گا۔ (۸۴)

(۴) بیعت اصل مقصد نہیں ہے' بلکہ ایک وسیلہ ہے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جتنے بھی جائز وسائل درکار ہوں ان کو استعمال کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے' لہٰذا بیعت ایک وسیلہ ہے نہ کہ مقصد' اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے جائز ہے۔

(۵) اگر بیعت ایک جائز کام کے لیے ہو تو وہ بیعت جائز ہے اور اگر بیعت ناجائز کام کے لیے ہو تو وہ ناجائز ہے' خواہ ایک جماعت کے لیے ہو یا امام المسلمین (خلیفہ) کے لیے' اس لیے کہ ارشادِ نبویؐ ہے: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) اور ((وَالطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ)) واللہ اعلم بالصواب۔

بعض شبہات اور اُن کا ازالہ

شبہ ۱ : کیا مفضول کو افضل پر امیر مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کو امیر مقرر کرنا جائز نہیں ہے' جبکہ ایسا کہنا درست نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں ایک لشکر' جس میں کبار صحابہ مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم موجود تھے' روم کی طرف بھیجنے کا حکم فرمایا۔ بخاری شریف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے:

عن عبد اللّٰه بن عمر انَّ رَسول اللّٰه ﷺ بعث بعثا امر علیهم اسامة بن زید فطعن الناس فی امارته فقام رسول اللّٰه ﷺ فقال: ((ان تطعنوا فی امارته فقد کنتم تطعنون فی امارة اَبِیْهِ من قبل وایم اللّٰه ان کان لخلیقا للامارة وان کان لمن احب الناس الیَّ وھذا لمن احب الناس الیَّ بعده)) (۸۳)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر تیار کیا اور اس پر اسامہ بن زید کو امیر بنایا تو لوگوں نے ان کی امارت پر طعن کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''اگر تم ان کی امارت پر طعن کرتے ہو تو تم تو ان کے باپ (زیدؓ) کی امارت پر بھی طعن کیا کرتے تھے' حالانکہ خدا کی قسم! وہ امارت کے لائق تھے اور وہ میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھے اور یہ (اسامہ) ان کے بعد میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہے''۔

حدیث اسامہؓ سے معلوم ہوا کہ چھوٹے کو بڑوں پر اور مفضول کو افضل پر امیر بنانا جائز ہے' بشرطیکہ اس میں اہلیت ہو۔ چنانچہ حدیث مذکور کے تحت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

قال بعض المحققین فیه جواز امارة المولیٰ وتولیة الصغار علی الکبار والمفضول علی الفاضل (۸۴)

''بعض محققین نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں غلام کی امارت اور چھوٹوں کی بڑوں پر اور مفضول کی فاضل پر تولیت وامارت کا جواز ہے''۔

جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے امیر لشکر بنایا تو ان کی عمر تقریباً ۱۹ سال تھی۔ یہ لشکرِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسامہؓ دراصل حضرت زید بن حارثہؓ کے انتقال کے بعد ان کے قائم مقام حضرت اسامہؓ کو سپہ سالار بنا کر تیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ فتح الباری میں ہے کہ: دعا اسامة فقال سر الٰی موضع مقتل ابیك ''نبی اکرم ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو بلا کر فرمایا کہ اپنے والد (حضرت زید) کے مقتل کی طرف جاؤ''۔

اب سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ اغیار تو تمام شعبوں میں الگ الگ اور خاص خاص نگران مقرر کریں اور ہر ہر شعبہ و محکمہ کے محکومین کو اس معین شخصیت کی اطاعت کا پابند بنائیں اور ہم لوگ اپنے پیغمبر ﷺ کے اس ارشادِ عالی کے متبع نہ ہوں جس میں فرمایا گیا: ((اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) ''کان لگا کر سن لو! تم سب نگران ہو اور اپنی رعیت اور ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہو''۔ اس ارشادِ عالی نے ہر صاحب امر کو حاکم اور نگران و ذمہ دار بنا دیا۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبْشِیٌّ کَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِیْبَةٌ))(۸۵)

''سنو اور اطاعت کرو اگرچہ حبشی غلام جس کا سر کشمش جیسا ہو تم پر حاکم بنا دیا جائے''۔

اس تشبیہہ کے ذریعے بتلا دیا گیا کہ امیر و ذمہ دارِ اعلیٰ میں کچھ ناگواری کی چیزیں بھی ہوں تب بھی اس کی اطاعت اور ماتحتی میں رہنا ضروری ہے' مخالفت اختیار کرنے کا حق نہیں ہے۔

شبہ ۲: اپنے عزیز و قریب اور معتمد کو کوئی منصب دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ امارتِ عظمیٰ ہو یا صغریٰ' اپنے عزیزوں کو کوئی منصب دینا جائز نہیں ہے' جبکہ یہ خیال درست نہیں۔ بشرطِ صلاحیت عزیز و معتمد کو منصب دیا جا سکتا ہے۔ اپنے کسی عزیز کو اُس کی صلاحیت کی بنیاد پر کوئی منصب دینے سے وہ اس کے لیے قوت کا سبب بنتا ہے' لٰہذا یہ بھی اس بات کے جواز پر ایک دلیل ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو وزیر بنانے کی درخواست میں یہی وجہ بیان فرمائی:

﴿وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾﴾ (طٰہٰ)

''اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون' جو میرا بھائی ہے' اُس کے ذریعے سے میری کمر مضبوط کر''۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا محمد سلیم اللہ خان شیروانی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اپنے اہل میں سے اپنا معاون مانگنے کی درخواست ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مستحسن امر ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ اپنے اہل کے تعاون و مدد کرنے میں ایک طبعی الفت و لگاؤ ہوتا ہے' وہ اپنے اہل کے بقیہ کام کو بڑی خوش اسلوبی' دلسوزی اور حوصلہ مندی سے بڑھا سکتا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا: ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یٰمُوْسٰی﴿۳۶﴾ (طٰہٰ) اے موسیٰ تمہاری درخواست قبول کی گئی'۔ مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات بالصراحت واضح ہوگئی کہ امیر کو اعانت کے لیے اپنے کسی اہل کی درخواست کرنا یا خود کو متعین کرنا خلافِ اولیٰ نہیں بلکہ عین قرین مصلحت وحکمت ہے اور حسن انتظام کے نقطۂ نظر سے احسن طریق میں سے ہے' کیونکہ الولد سر لابیه (بیٹا باپ کا بھیدی ہوتا ہے) اور صاحب البیت ادریٰ بما فی بیته کی رو سے گھر والا گھر کی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے' لہٰذا ایسی صورت میں اقرباء نوازی اور کنبہ پروری سمجھنا اور اعتراض کرنا کم علمی کی دلیل ہے''۔(۸۶)

حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی جو اولاد سے محروم تھے' اپنا وارث بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اولاد کی درخواست کی:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ﴿۳۸﴾﴾ (آل عمران)

''اے میرے ربّ! مجھے اپنے پاس (اپنی قدرت) سے پاک اولاد عطا فرما۔ بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے''۔

ایک اور جگہ ان کی دعا یوں نقل ہوئی ہے:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ﴿۸۹﴾﴾ (الانبیاء)

''اے میرے ربّ! مجھے تنہا نہ چھوڑ' اور تو بہترین وارث ہے''۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

واحب (زکریا) من یونسه ویقویه علی امر دینه ودنیاه ویکون قائما مقامه بعد موته فدعا اللّٰہ تعالی دعاء مخلص عارف(۸۷)

''اور حضرت زکریا علیہ السلام نے ایسا وارث چاہا جو اُن کے لیے مونس ہو' اور انہیں دینی اور دُنیوی معاملے میں تقویت دے اور ان کی وفات کے بعد اُن کا قائم مقام ہو جائے' لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مخلص عارف کی طرح دعا کی''۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ نے امام بنانے کی خوشخبری سنائی: ﴿اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ''میں یقیناً تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں'' تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے درخواست پیش کی: ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ ''اور میری اولاد میں سے بھی'' تو ارشاد ہوا: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ (البقرۃ) ''میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا''۔ اس آیت کے تحت بیضاوی شریف میں ہے: ''اجابة من ملتمسه وتنبیه'' یعنی ان کی درخواست کی قبولیت بھی ہے اور (قبولیت کی شرط پر) تنبیہ بھی ہے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب امامت ونبوت ان کی اولاد میں ہی رہے گا بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ چنانچہ دوسری آیت میں صراحتاً اس کا ذکر ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ (العنکبوت) ''اور ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کی اولاد میں نبوت اور کتاب کو طے کر دیا''۔ اسی سبب سے نسلاً بعد نسل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہی کی اولاد میں نبوت وملوکیت چلتی رہی۔

شبہ ۳: کیا اولوالامر کے معنی صرف سلاطین‘ حکام یا علماء تک مخصوص ہیں؟

ایک اور شبہ جو اہل علم کے ہاں بکثرت پایا جاتا ہے‘ وہ یہ ہے کہ اولی الامر کے معنی صرف سلاطین‘ حکام یا علماء تک مخصوص ہیں۔تو آیئے کہ اب ذرا اولی الامر کے مفہوم کو سمجھیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج﴾ (النساء:۵۹)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی‘ اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی“۔

اس آیت شریف میں صاف طور پر اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے‘ اس لیے اولوالامر کا مصداق جاننا بھی ضروری ہے۔”امر“ ہر مہتم بالشان قول وفعل کو کہتے ہیں اور یہ لفظ حکم کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔اولی عربی زبان میں جمع کے لیے آتا ہے اس لیے اولی الامر کے معنی ”حکم والے“ ہوئے۔اس لفظ کے معنی سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لفظ صرف حکام وسلاطین کے ساتھ خاص نہیں‘ بلکہ اس میں عموم وشمول ہے‘ جیسا کہ ذیل کی کتب تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔صاحب انوار التنزیل فرماتے ہیں:

(اولی الامر) یرید بھم امراء المسلمین فی عھد رسول اللّٰہ ﷺ وبعدہ ویندرج فیھم الخلفاء والقضاۃ وامراء السریۃ و قیل علماء الشرع(۸۸)

”اولی الامر سے عہد نبوی اور بعد کے امراء مسلمین مراد ہیں اور اس میں خلفاء‘ قاضیان‘ امراءِ لشکر سب داخل ہیں اور کہا گیا ہے کہ علماء شرع بھی اس میں داخل ہیں۔“

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ:

والظاھر انھا (ایۃ اولی الامر) عامۃ فی کل اولی الامر من الامراء والعلماء(۸۹)

”اور ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت امراء اور علماء وغیرہ ہر حکم والے کے لیے ہے“۔

تفسیر خازن میں ہے:

قال الزجاج واولی الامر من یقوم شان المسلمین فی امر دینھم وجمیع ما ادّی الیہ صلاحھم(۹۰)

”اولی الامر وہ تمام اشخاص ہیں جو مسلمانوں کے دینی امور اور ان کی صلاح کی چیزوں کے قیم ومنتظم ہوں“۔

مندرجہ بالا تفاسیر سے ظاہر وباہر ہے کہ اولی الامر سے مراد صرف حکام یا سلاطین ہی نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم بہت عام ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ نے ”الابواب والتراجم“ میں اولی الامر کی مراد میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ عینی نے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد آخری قول اس کے عام ہونے کا نقل فرمایا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ بھی اسی رجحان کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

الحادی عشر عام فی کل من ولی امر شیءٍ وھو الصحیح والیہ مال البخاری بقولہ ذوی الامر (۹۱)

''گیارہواں قول یہ ہے کہ یہ لفظ ہر اُس شخص کے لیے عام ہے جو کسی امر کا والی ہو اور یہی صحیح ہے' اسی کی طرف امام بخاریؒ مائل ہوئے ہیں۔''

نیز تفسیرات احمدیہ مؤلفہ ملا جیونؒ میں ہے:

والحق ان المراد بہ کل اولی الحکم اماما کان او امیرًا سلطانا کان او حاکمًا عالما کان او مجتھدًا قاضیا کان او مفتیا علی حسب مراتب التابع والمتبوع لان النص مطلقٌ فلا یقید من غیر دلیل الخصوص (۹۲)

''اور حق بات یہ ہے کہ اولی الامر سے ہر صاحب حکم مراد ہے خواہ امام ہو یا امیر' سلطان ہو یا حاکم' عالم ہو یا مجتہد' قاضی ہو یا مفتی' تابع اور متبوع کے مراتب کے اعتبار سے (سب مراد ہیں)' اس لیے کہ نص (قرآنی) مطلق ہے' لہٰذا اس کو بلا دلیل کے مقید نہیں کیا جا سکتا۔''

نیز احادیث ذیل سے بھی اس کا بخوبی پتا چلتا ہے کہ امیر اور اولی الامر کا مفہوم شریعت کی اصطلاح میں عام ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا کَانَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ)) (۹۳)

''جب تین آدمی سفر میں ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں۔''

(یہاں تین آدمیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس زمانے میں امن نہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یا دو آدمیوں کو سفر کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ اب اس کا وجوب تو ختم ہو گیا ہے استحباب باقی ہے) اس حدیث شریف سے واضح ہو گیا کہ امیر سے مراد صرف سلطان یا حاکم نہیں ہے' بلکہ اس میں بہت عموم ہے۔ حتیٰ کہ سفر کے رفقاء کو بھی یہ حکم ہے کہ اپنے کسی رفیق کو امیر بنا کر اس کی اطاعت کو لازم کر لیں' کیونکہ عقل سلیم کا بھی تقاضا ہے کہ مدار کار کسی شخص واحد پر ہو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ ' فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِہٖ وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ عَنْھُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْہُ ' اَلَا فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) (۹۴)

''غور سے سنو! تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے متعلق سوال ہو گا۔ پس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کا امام اُن کا نگہبان ہے اور اس سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور آدمی اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔ اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔ خوب یاد رکھو کہ تم میں ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا''۔

اس حدیث شریف میں رعیت کے لفظ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنے ماتحت کا امیر ہے۔

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات بالبداہت والصراحت ثابت ہوگئی کہ لفظ امیر ہر اُس شخص پر جس کے کچھ ماتحت ہوں' شرعی طور پر مستعمل ہوا ہے۔ اس کی اطاعت کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے لہٰذا اس کی اطاعت واجب ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب کے شاگرد رشید مولانا فتح محمد اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''خلاصۃ التفاسیر'' میں اولی الامر کے متعلق مختلف مرادوں کا ذکر فرما کر بیان کرتے ہیں:

''اولی الامر سے عام مراد لی جائے' یعنی ہر کام میں اس کا حاکم ومختار اولی الامر ہے تو ان تمام صورتوں کو بلا تکلف شامل ہے جیسا کہ مسلم و بخاری نے روایت کیا کہ فرمایا: اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ''تم سب چرواہے (نگران) ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے متعلق سوال ہوگا'' اور فرمایا کہ امام رعیت کا راعی ہے اور زوج زوجہ کا اور مرد اپنے گھر والوں کا اور عورت اپنے شوہر کے مال و عیال میں اور غلام اپنے مولا کے مال میں راعی اور ذمہ دار ہے۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہے کہ داروغہ اپنے ماتحتوں میں اور آقا اپنے نوکروں میں اور ہر شخص اپنے متعلقین کے حق میں آمر (امیر) ہے اور یہ باز پرس جو اُس کے ذمہ لازمی کی گئی ہے' بالضرورت چاہیے کہ وہ لوگ اس کے مطیع ہوں۔ پس ایسی تمام صورتوں میں بقدر قوت وحیثیت اطاعت لازم ہوگی''۔(۹۵)

امام غزالی اس حدیث کی شرح میں کہ ''سفر میں جب تین آدمی ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں'' ارشاد فرماتے ہیں: ''اس واسطے کہ سفر میں رائیں مختلف ہوتی ہیں اور جو کام ایک شخص سے متعلق نہ ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا''۔(۹۶)

یہاں تک کے بیان سے بالصراحت یہ امر ثابت ہو گیا کہ اولی الامر کو صرف سلاطین و حکام میں منحصر و مقید سمجھ لینا اور دیگر اولی الامر کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

شبہ ٤: کیا امیر مشورہ کا پابند ہے؟

ایک شبہ یہ بھی ہے کہ امیر مشورہ کا پابند ہے اور کثرت رائے کی صورت میں امیر کو نفاذِ امر کا اختیار نہیں ہے۔ اس شبہ کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے' تاکہ اصل موضوع واضح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جائے۔ مشورہ‘ مشاورت‘ شوریٰ تینوں الفاظ مترادف اور ہم معنی ہیں جن کے معنی مختلف آراء معلوم کرنا ہے اور رائے دینے والوں کا کام صرف رائے دینا ہے۔ رہا اس کا نفاذ کرنا یا اس پر عمل کرانا‘ تو یہ ان کا کام نہیں‘ یہ ان کے دائرۂ عمل سے بالکل باہر ایک الگ چیز ہے۔ یعنی مشورہ‘ مشاورت اور شوریٰ کی حقیقت کسی امر میں صرف مختلف آراء معلوم کرنا ہے اور مشورہ دینے والوں کا کام صرف اپنی اپنی آراء اس امر کے بارے میں ظاہر کر دینا ہے‘ لیکن ان آراء میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا یا ان سب آراء کو چھوڑ کر اپنی رائے پر عمل اور اس کو نافذ کرنے کا حق صرف اولی الامر یعنی امیر کو ہے‘ خواہ وہ امیر یا حاکم گھر کا ہو جیسے والد‘ یا اقامت نماز کا ہو یعنی امام‘ یا مدرسہ کا ہو یعنی مہتمم‘ یا حج کرانے کا ہو یعنی امیر الحج‘ یا ملک کا ہو یعنی سلطان‘ یا شہر کا ہو یعنی عامل (کلکٹر)‘ یا لشکر کا ہو یعنی سپہ سالار (کمانڈر)‘ یا کچہری کا ہو یعنی قاضی (جج) یا جماعت کا رہبر و لیڈر رہو وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ دُنیوی و ملکی نظام قائم کرنے کے لیے ہر ہر محکمہ و شعبہ میں الگ الگ ذمہ دار و امیر ہوتا ہے اور ان کے ماتحت ان کے تابع و مطیع ہوتے ہیں‘ کیونکہ اس کے بغیر نظامِ ملکی و دُنیوی درہم برہم اور تباہ ہو جاتا ہے۔ تو جب ملکی نظام و انتظام ہر ہر شعبے و محکمے کے الگ الگ متعین امیر کی اطاعت کے بغیر نہیں چل سکتا تو دین کا معاملہ بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے۔ بہر حال مشورہ نافذ کرنے کا حق امیر کو ہے یا مشیروں کو‘ درست بات یہ ہے کہ امیر کے لیے مشورہ لینا صرف امر مستحسن ہے۔ نیز مشیرین کا کام اس کو مشورہ دینا اور اپنی رائے ظاہر کر دینا ہے۔ اب اگر امیر اُن کے مشورے پر عمل کرے تو اس کو عامل بالمشورہ کہنا درست ہے‘ لیکن اگر مشیرین کے مشورہ پر عمل نہ بھی کرے تب بھی اسے عامل بالمشورہ لازماً کہا جائے گا‘ کیونکہ مشیروں کے مشوروں کے ساتھ اس کا بھی ایک مشورہ شامل تھا‘ اس نے اپنے مشورہ پر عمل کر لیا۔ پھر اگر مشیروں کے مشورہ پر عمل کرے تو اس کو یہ اختیار ہے کہ اکثریت کو ترجیح دے یا اقلیت کو‘ کیونکہ وہ امیر ہے اور امیر با اختیار ہوتا ہے۔ اور مشیر واحد ہو یا جماعت وہ صرف مشورہ دینے والے ہیں‘ با اختیار نہیں ہیں‘ جس کی وضاحت مختلف تفاسیر میں موجود ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

(۱) **فَاِذَا عَزَمۡتَ (ای اذا عقدت قلبك علی الفعل وامضائیه بعد المشورة)**(۹۷) ’’پس جب آپ عزم کر لیں‘ یعنی مشورہ کے بعد اس کام کے اجراء اور نفاذ پر آپ اپنے دل میں پختہ ارادہ کر لیں‘‘۔

(۲) **فَاِذَا عَزَمۡتَ (علی امضاء ما ترید بعد المشاورة فَتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ (ثقه به لا بالمشاورة)**(۹۸) ’’پس مشورہ کے بعد آپ نے جس چیز کا ارادہ کیا ہے اس کے جاری کرنے کا جب آپ عزم کر لیں تو مشورے پر نہیں‘ بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجیے‘‘۔

(۳) **فَاِذَا عَزَمۡتَ (فاذا قطعت الرأی علی شیء بعد الشوریٰ)**(۹۹) ’’پس جب آپ عزم کر لیں‘ یعنی جب آپ کسی شے پر بعد مشورہ کے قطعی رائے قائم کر لیں‘‘۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴) فَاِذَا عَزَمْتَ علی شیء بعد المشورة(۱۰۰) ''جب آپ کسی چیز کا مشورہ کے بعد عزم کرلیں''۔

(۵) فاذا وطنت نفسك علی شیء بعد الشوریٰ(۱۰۱) ''جب آپ مشورہ کے بعد اپنی طبیعت کو کسی چیز پر جمادیں''۔

(٦) فَاِذَا عَزَمْتَ ای عقیب المشورة علی شیء واطمانت به نفسك(۱۰۲) ''پس جب آپ عزم کرلیں، یعنی مشورہ کے بعد کسی چیز کا عزم کرلیں اور آپ کی طبیعت اس کے ساتھ مطمئن ہو جائے''۔

نیز ''بیان القرآن'' میں اس آیت کی تفسیر میں تحریر ہے:

> ''اور بدستور ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے' تاکہ ان کا اس سے اور دونا جی خوش ہو۔ پھر مشورہ لینے کے بعد جب ایک جانب رائے پختہ کرلیں' خواہ وہ ان کے مشورے کے موافق ہو یا مخالف ہو سو خدائے تعالیٰ پر اعتماد کر کے اس کام کو کر ڈالا جائے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے جو خدا تعالیٰ پر اعتماد رکھیں' محبت فرماتے ہیں''۔

آگے فائدہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ جو کہا گیا کہ خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو' دلیل اس کی یہ ہے کہ لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی اور اس سے معلوم ہوا کہ امور انتظامیہ متعلقہ بالرائے والمشورہ میں کثرتِ رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے' ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرتِ رائے کے خلاف نہ ہو''۔(۱۰۳)

دیکھئے ان تمام مفسرین نے ایک ہی بات بیان فرمائی ہے کہ مشورے کے بعد آپ جس رائے کو چاہیں اختیار کرلیں' خواہ وہ اقلیت کا مشورہ ہو یا اکثریت کا یا اپنا۔ اگر مشورے کے بعد فیصلہ کثرتِ رائے کے سپرد ہوتا تو فَاِذَا عَزَمْتَ کی بجائے جمع کا صیغہ ''فَاِذَا عَزَمُوْا'' آتا یا ''فَاِذَا عَزَمَ اَكْثَرُهُمْ آتا' مگر ایسا نہیں فرمایا' بلکہ واحد مخاطب کا صیغہ ارشاد فرمایا گیا۔ ان تفصیلی بیانات و تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ امیر کو ہر طرح کا اختیار ہے' وہ چاہے تو کسی کا مشورہ مان لے اور چاہے تو اپنی رائے پر ہی فیصلہ کرے۔ اس موقف کی مزید تائید احکام القرآن للجصاص کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے:

وکان رسول الله ﷺ اذا شاورهم فاظهروا آراء هم ارتای معهم وعمل بما اداه اليه اجتهاده(۱۰۴)

> ''رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرماتے تھے اور وہ اپنی اپنی آراء ظاہر فرماتے تھے تو آپ بھی ان کے ساتھ رائے ظاہر فرماتے تھے اور جس طرف آپ کا اجتہاد پہنچتا عمل فرماتے''۔

آگے مزید تفصیل بتاتے ہوئے صاحب احکام القرآن فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فجائز حینئذ ان توافق آراء هم رأی النبیﷺ وجائز ان یوافق رأی بعضهم وجائز ان یخالف رأی جمیعهم فیعمل ﷺ حینئذ برأیه (۱۰۵)

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مشورہ کی تین صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ مشورہ کے وقت صحابہؓ کی رائے آنحضرت ﷺ کی رائے کے موافق ہو۔ دوسرے یہ کہ بعض صحابہ کی رائے آپ کی رائے کے موافق ہو اور تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ تمام صحابہؓ کی رائے آپ کی رائے کے خلاف ہو۔ اکثر و بیشتر آپؐ اپنی رائے پر عمل فرماتے تھے۔ الغرض تفاسیر مذکورہ کے ساتھ احکام کی تشریح سے بھی یہ بالکل ثابت ہو گیا کہ نفاذ امر کا اختیار صرف امیر کو ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے ہاں ایک غلط فہمی یہ ہوئی کہ امیر کو مأمور اور مشیروں کو امیر کا درجہ دے دیا گیا ہے اور یہ دستور غیر شرعی ہے۔ یہ غیر شرعی چیز بعض اسلامی تحریکوں میں اغیار سے درآمد ہوئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی تحریکوں سے اس کو دور کر کے دستور کو شرعی اصول کے مطابق ہی رکھا جائے۔ ایسے غیر شرعی نظام پر ملک کے جمہوری طرزِ حکومت سے استدلال کرنا' خصوصاً اہل علم کا' یہ بڑی حیرت کی بات ہے' کیونکہ مندرجہ بالا بیانات سے واضح ہو گیا کہ شرعی نظامِ حکومت میں نہ خالص شخصی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) کا جواز ہے نہ مروّجہ جمہوریت کا جواز ہے' بلکہ ایک ایسا امیر ہو جو مشورہ سے نہ تو مستغنی ہو اور نہ مشیروں کا تابع ہو' کیونکہ شریعت محمدیہؐ میں افراط و تفریط نہیں بلکہ اعتدال اور توسط ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳) لیکن مروجہ جمہوریت میں فیصلہ اکثریت پر ہوتا ہے اور امیر ان کے تابع ہوتا ہے جو بالکل خلافِ عقل وفطرت ہے۔ آپ گھر کی حکومت کو لے لیجیے۔ کیا اولاد کثرتِ رائے سے اپنے باپ کی حکم عدولی کر سکتی ہے اور یہ کہہ سکتی ہے کہ ہم کمار ہے ہیں لہٰذا آپ ہمارے نوکر ہیں' سبزی گوشت لائیے اور جو ہماری شوریٰ پاس کرے وہ کیجیے؟ ہرگز نہیں' کوئی عاقل اس کو تسلیم نہیں کر سکتا' کیونکہ باپ حاکم ہے' بیوی اور اولاد اس کی رعیت ہے۔ سب پر اس حاکم کی اطاعت واحترام واجب ہے۔ یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر والد ایک حکم دے اور والدہ دوسرا تو اطاعت والد کی کی جائے گی' کیونکہ وہ دونوں کا امیر و حاکم ہے' البتہ حسن سلوک میں والدہ مقدم ہے۔ اسی طرح حالتِ نماز میں امام اور مقتدی میں اختلاف کی صورت میں امام کی رائے مانی جائے گی خواہ مقتدیوں کی کتنی ہی کثرت ہو۔

(یہ مضمون اِن شاء اللہ العزیز آئندہ اشاعت میں مکمل ہوگا۔ اس قسط کے حواشی بھی مضمون کے آخر میں دیے جائیں گے۔)

❁❁❁

© rasailojaraid.com